ACADEMIA International Journal for Social Sciences
Volume 5, Issue 3, 2026 ISSN-L (Online): 3006-6638

# تانیثیت کی ابتدا ،ارتقا اور روایت کے بنیادی مباحث

**Dr. Shabana Aman Ullah**
drshabanaamanullah@gmail.com
Principal/Associate Professor, Govt. Graduate College For Women, Zafar Ul Haq Road Rawalpindi

**Corresponding Author: Dr. Shabana Aman Ullah** drshabanaamanullah@gmail.com
**Received:** 03-02-2026 **Revised:** 18-02-2026 **Accepted:** 05-03-2026 **Published:** 22-03-2026

## ABSTRACT

*Feminism emerged in the West as an intellectual and social movement that challenged women's legal, educational, and political exclusion. It gradually developed into a significant literary phenomenon through the works of writers and thinkers who questioned gender inequality and women's representation in literature and society. During the twentieth century, Virginia Woolf and Simone de Beauvoir played a major role in establishing feminist thought within literary and cultural studies by examining women's exclusion from education, literature, and public life and by questioning the social construction of gender.*

*In the Indian subcontinent, debates on women's rights appeared during the colonial period through Muslim social reform movements. The educational reforms associated with Sir Syed Ahmad Khan and the Aligarh Movement influenced discussions on women's education and social status. Reformers such as Altaf Hussain Hali, Shibli Nomani, and Deputy Nazir Ahmad supported women's education and moral development, although they generally viewed women's roles within the family and domestic sphere rather than advocating complete gender equality. Urdu journals, particularly Tehzeeb-e-Niswan, provided an important platform for discussions on women's education, child marriage, health, domestic life, and other social issues affecting women. These debates emerged in a society where many women experienced social marginalization and unequal access to education, and where practices such as child marriage and the historical memory of sati reflected broader patterns of gender inequality. At the same time, history also presented examples of women exercising political authority, including influential Mughal royal women and the Begums of Bhopal. Together, these developments demonstrated that ideas concerning women's rights evolved differently in the West and in colonial South Asia, reflecting distinct historical, cultural, and political contexts.*

***Keywords:*** *Feminism, Women's Rights, Gender Equality, Women's Education, Aligarh Movement, Urdu Literature.*

### لفظی مفہوم:

**تانیثیت** انگریزی میں **Feminism** کا اُردو ترجمہ ہے۔ **عربی میں تانیثیت بطورِ زنانہ ، نسوانی یا نسائی** معنوں میں مستعمل ہے۔ **انگریزی میں Feminism** مساواتِ نسواں ،صنفی تفریق کی مخالفت میں مرد اور عورت کے برابری کے حقوق کی حمایت میں سمجھا جاتا ہے۔

### اصطلاحی مفہوم:

تانیہیت کی اصطلاح مغرب میں متعارف ہونے والی تحریک **Feminism** کا اُردو ترجمہ ہے ۔اس اصطلاح کو مشرق اور مغرب کے تمام معاشروں میں اُس کی اپنی روایات ،تہذیب اور ثقافت کے رنگوں کی آمیزش کے اعتبار قبول کیا گ یا۔ تانیہیت بحیہیت مجموعی خواتین کے ساتھ روا رکھنے والے امتیازی سلوک کی مذمت اور اُنھیں انسان کی حیثیت سے تمام حقوق دلوانے کی ایک کاوش یا تحریک قرار دیا گیا۔

### ادبی مفہوم:

اگر **تانیثیت** کے ادبی مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو یہ خواتین کواپنے حقوق کی جدوجھد می ں خودکو انسان تسلیم کروانے کی قلمی سعی ہے ۔تانیہیت وسیع

معنوں میں ایک ایسی تھیوری ہے جو مردوں کے معاشرے میں عورت کو بحیثیت انسان پیش کر کے تمام سیاسی ،سماجی ، معاشی ، قانونی اور وراثتی حقوق کے برابری کی سطح پر حصول کی غمازی کرتی ہے ۔

تاریخ عالم مرد اور عورت کی متنوع حیثیتوں کی نمائندگی کرتی رہی ہے ۔کہیں یہ مدرسری معاشرے میں عورت کی کلیدی حیثیت کو نمایاں کرتی ہے اور جہاں پدرسری نظام رہا وہاں مرد کے مرکزی کردار کو پیش کرتی ہے ۔عہد حاضر بھی اِسی ارتقائی سفر کا آئینہ دار ہے۔

**فاطمہ حسن رقم طراز ہیں:**

> "جنوبی ایشیا کے پس منظر میں دیکھیں تو پاکستان، ہندوستان ،بنگلہ دیش ،نیپال اور سری لنکا کی خواتین نے اپنے مختلف ورکشاپس میں فیمینزم کی دو تعریفیں اس طرح کی ہیں۔"(1)

> "Feminism is awareness of women oppression and exploitation in society, at the place of work, with in the family and conscious actions to change this situation."

دوسری تعریف کے مطابق:

> "Feminism is an awareness of patriachal control exploitation and oppression at the material and ideological level of women's labor ,fertility and sexuality and in the family at the place of work and in society in general and conscious action by ."

**"عورت** "کی تشریح و تعبیر اس کے کردار اور اہمیت کے مباحث زمانہ قدیم سے چلے آرہے ہیں ۔عورت ذات دنیا کا قدیم اختلافی موضوع ہے ۔بائبل کی حوا اور یو نانی تصورات سے لے کر عہد ح اضر تک متعدد مذاہب ،متنوع تہذیبوں اور اقوام نے اس کا حقیقی پہلو تلاش کرنے کی کوشش کی ۔کبھی تصوراتی انداز سے تشریح و تعبیر کی ۔کبھی اس کی اہمیت حمورابی کے کتبے ،موسوی الواح ،اشوک کی لاٹھ، اجنتا کے غار، بدھا کے اشٹ مارگ ،منو کے پنچ تنتر، تاؤ کے فلسفے، زرتشت کی اوسطا، کنفیوشس کا نظریہ ،اور مسیح کی گواہی پیش کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں جا لینوس، فیثاغورث، بطلیموس ،اقلید س ،لقمان ،سقراط، بقراط ،ارسطو، افلاطون ،ابن سینا ،عطار، رومی رازی، خیام، جامی، سعدی، فریہ کلن ،ریپوٹن، کولرج، ملٹن، ہیوگو، بائرن ،ہائنیز، رسکن، واہیپر، سٹینلے آرتھر مور ،ایمرسن شیکسپیئر، دانتے، تلسی ،خسرو، میر، غالب، جوش ،فیض کے ہاں عورت کی ذات کی مختلف جہات کی عکاسی کرتے ہیں۔

کبھی مرد نے عورت کو دیوی بنا کر اس کے قدموں میں سجدہ عقیدت پیش کیا اور پھر بعد ازاں ،بغداد، مصر ،یونان اور روم کے بازاروں میں بطور جنس پیش کیا۔ اس کی مختلف قیمت اور دام وصول کرنے کے ساتھ ساتھ زندہ دیواروں میں چنوایا گیا ،کبھی زندہ عورت کو مردہ مرد کے ساتھ چتا میں جلادیا گیا۔ دوسری طرف دیکھیں تو تاج محل، شیش محل، بارہ دریاں اور قلعے تعمیر کر کے اس کی نذز کیے گئے ۔تیسرا رخ اس عورت کی نمائندگی کرتا ہے جو کھیت کھلیانوں میں محنت کر کے خون پسینہ بہا رہی ہے ۔اپلے تھاپ رہی ہے یا سڑکوں کی تعمیر میں نازک قرار دیے جانے والے ہاتھوں سے پتھر توڑ رہی ہے۔ تعلیم یافتہ ہو تو وہ ڈاکٹر، استانی، دفتر میں کام کرنے والی ہے ۔اشتہارات کی بدولت سرمایہ دار کی جیب بھرنے والی ماڈل اور تفنن طبع کے لیے فلموں ،ڈراموں کی ہیروئن ہے۔

عورت کی شخصیت کے مختلف روپ بہروپ میں حسن کی دیوی محبوبہ، ماں ،بہن، بیٹی، بیوی، کنیز، لونڈی حتی کہ طوائف تک بحیثیت مجموعی اس کا استحصال جاری رہا ۔معاشرتی جبر، صنفی امتیاز ،کا شکار ہو کر اسے نفرت اور حقارت کا نشانہ بننا پڑا۔

انسانی تاریخ کا سفر عہد حاضر کے ترقی یافتہ تصور زندگی کے حصول کی پار ینہ داستان پیش کرتا ہے۔ محققین کے مطابق کرہ ارض پر انسان کی آباد کاری تقریبا

پانچ لاکھ سال کے لگ بھگ ہے۔ عموماً علمائے تاریخ انسانی تہذیب کے تین ادوار کا ذکر کرتے ہیں۔ پہلا دور قدیم ترین پتھر کا تھا۔ یہ بھی تین زمانوں پر مشتمل ہے ۔پتھر کا یہ دور پانچ ہزار سال قبل مسیح کو محیط ہے ۔اس کے بعد کانسی اور پھر لوہے کا دور آیا جو آج تک جاری ہے ۔

اسی دوران میں لا تعداد تہذیبیں اور اقوام وجود میں آئی اور فنا ہوتی چلی گئیں۔ عورت کو سب سے پہلے ناہید ،زہرہ، وینس ،اور موک سے متعلقہ دیوی عشیار قرار دیا گیا ۔درج بالا تصورات یہودی نصرانی اور مختلف قوموں کی زندگیوں کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ گویا انسان کا پہلا معبودِ انسانی ایک دیوی کی صورت میں متشکل تھا ۔

مدرسری نظام کی ابتدا عورت کے معاشرے میں فعال کردار کی بدولت ہوئی۔ عورت غذائی نباتات جمع کرتی تھی اور گندم کی افادیت کے پیش نظر منظر عام پر لانے والی عورت ہی تھی۔ جس کی کاشت عراق میں ہوئی ۔ تمدنی انقلاب اور زراعت کاری کو رواج دینے والی ہستی مدرسری نظام کا غالب عنصر تھی۔ نیز مادہ کے بطن سے انسان کا جنم اسے سماجی برتری دلا کر دیوی کے مرتبے پر فائز کرتا تھا ۔ لہذا قدیم مصری تہذیب سے لے کر دیگر کئی تہذیبوں میں بحیثیت ماں اس کی برتری قائم تھی۔ عورت راج میں مردوں کی بالادستی ختم کرنے کے لیے طرح طرح کے قوانین رائج تھے۔

ڈاکٹر عقیلہ جاوید ''**اُردو ناول میں تانیثیت**'' میں رقم طراز ہیں:

"بعض تہواروں میں اب بھی لیکن شاذ پجاری اپنا گوشت کاٹ ڈالتے ہیں اور اس ظالم دیوی کو خوش کرنے کے لیے اپنا جسم جلا ڈالتے ہیں۔"(2)

ہند کی مقامی قوم دراوڑ تھی مگر آریاؤں نے جب مہا بھارت جنگ میں فتح پائی تو ان کی عورتیں جو انتہائی قدر و منزلت کی حامل سمجھی جاتی تھیں ان سے زبردستی شادیاں کیں اور پھر ان دو تہذیبوں کے ملاپ سے جنم لینے والی تہذیب میں مرد نے عورت کا استحصال کرنا شروع کیا ۔ان کے دور میں کم سن لڑکیوں سے شادی اور ستی جیسی رسموں کا آغاز ہوا ۔معبد ،مندراور چرچ کے نام پر خواتین پر بہت ستم ڈھائے گئے۔ ان میں رہباؤں، ننوں اور دیوداسیوں کے نظام کے علاوہ نیل اور گنگا میں کنواری لڑکیوں کو قربان کرنا بھی شامل ہے۔

''**مدرسری نظام** "میں ماں کو کلیدی حیثیت حاصل ہے ۔ **سیمون دی بووار(Simone de Beauvoir)** نے اپنی کتاب **''عورت'' (The Second Sex)**میں اس نظام کے حوالے سے مرکزی کردار عورت کو'' **گریٹ مادر** ''قرار دیا''۔ (3)

مرد چوں کہ عورت سے جسمانی حوالے سے طاقت اور قوت میں فوقیت رکھتا ہے اور بطور گھر یا قبیلے کے سربراہ کے اپنا کردار ادا کرتا ہے ۔للہذا وہ پدرسری نظام معاشرت کی بنیادی اکائی بن گیا۔

دنیا کی انسانی آبادی میں کم و بیش نصف تعداد خواتین کی ہے ۔ للہذا اُس کی معاشرتی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ۔ تانیثیت کی تھیوری اسی احساس پر قائم ہے کہ جس طرح مرد جذبات ، احساسات اور گوشت پوست کا مجموعہ ہے اسی طرح خواتین بھی ان خصائص کی بنا پر مردوں کے مساوی ہیں۔ عورتیں اپنے مخصوص دائرہ کار بشمول دُنیاوی معاملات اور مسائل میں مردوں کی طرح ایک فعال کردار ادا کرتی ہیں۔بقول افضل الرحمن ہر جنس اپنے طریقے سے اپنے دائرے میں جدوجہد کرتی ہے اور معاشرے کی مجموعی فکری و معاشی دولت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔ کام کی نوعیت میں اختلاف کو بنیاد بنا کر ایک کے مقام و مرتبے کی برتری کو تسلیم نہیں کیا جا سکتا ۔ مسلم معاشرہ ہی نہیں کسی بھی معاشرے میں اختلافِ دائرہ کار اور مقام و مرتبہ میں کمی بیشی کو عزت و ذلت کا معیار نہیں بنایا جا سکتا ۔

تانیثیت کو مشرق اور مغرب دونوں معاشروں میں منفی اور مثبت دونوں نقطہ نظر سے بیان کیا جاتا ہے ۔پدرسری معاشرے نے عورت کے بنیادی حقوق غصب کر کے اُسے ایک چیز ،غلام اور مغلوب صنف قرار دیا ۔اس رویے کے خلاف حقوقِ نسواں کی سیاسی اور معاشی رجحان پر مبنی تحریک نے جنم لیا ۔ جو ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی تمام شعبہ ہائے زندگی کو اپنے دائرے میں سمیٹتی ہوئی تانیثیت ( **Feminism** )کی صورت اختیار کر کے مقبول ہوئی۔ اس

تحریک کے زیر اثر معاشرے میں عورت کے مرتبہ و مقام کی بازیافت اور صنفی تفریق پر مبنی روایات پر تنقید کی گئی ۔رفتہ رفتہ یہ اپنی گوناگوں جہات اور مسائل کی نوعیت سے اتنی وسعت پذیر ہوئی کہ اس کی تاحال ایسی کوئی تعریف نہیں کی جا سکتی جسے جامع اور مکمل قرار دیا جا سکے ۔اس کی وجہ غالباًعہد در عہد برپا ہونے والی تبدیلیاں اور سماجی تقاضے ہیں۔

**تانیثیت کا دائرہ کار**

**عورتوں پر تشدد کے خلاف مروجہ تھیوری میں مرتبہ لیزہ ایس پرائس( Lisa S.Price ) لکھتی ہیں :**

> "Feminism is also a method of analysis, a standpoint a way of looking at the word from the prospective of women. It questions government Policies, Popular culture, ways of doing and being and ask how women's lives are offered by these ideological and institutional politics". (4)

یعنی تانیثیت کا دائرہ کار حکومتی پالیسی، تہذیب، ثقافت، وجودِ نسائی، اِدارہ جاتی اور نظریاتی حدود کا احاطہ کرتا ہے۔

فیمینزم کا لفظ 1871 ءمیں میڈیکل سائنس کی ایک اصطلاح **Feminisation** بطور نسائی علامت کے استعمال ہوا۔ الیگزینڈر ڈومس) **Alexander Dumas )** نے 1872ء میں مردانہ خصوصیات کی حامل عورت کو**homme Femme**قرار دیا اور 1910ء کے بعد یہ یورپ میں فیمنزم کی وہ تحریک کہلایا جس میں حقوق نسوا ں کے لیے آواز بلند کی گئی۔ عورت کو اُس کے بنیادی حقوق سے محروم کرنے کے خلاف صدائے احتجاج بلند ہوئی اور اُنیسویں صدی کے ساتھ ساتھ بیسویں صدی کے اوائل میں خواتین مردوں کے مساوی حقوق حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کرتی نظر آئیں۔ اس عہد کی تحریک کو نسائی تحریک کا نام دیا گیا ۔جس می ں خواتین نے قانونی اور سیاسی حقوق حاصل کرنے کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔

تانیثیت کی تحریک کا مقصد عورت کو ایک ایسا سماجی نظام دینا ہے جہاں اُسے کوئی خوف ، ڈر ، اندیشہ یا جنسی استحصال کا سامنا نہ کرنا پڑے۔جہاں اس کو اپنی بھرپور صلاحیتوں کے استعمال کے یکساں مواقع میسّر ہوں ، اُسے اپنی زندگی کے بنیادی فیصلوں کی روشنی میں زندگی گزارنے کا حق حاصل ہو۔ مرد اور عورت کے درمیان ایسا رشتہ ہو جس کی بنیاد سماجی ، سیاسی اور اقتصادی برابری پر ہو۔ مختصرا یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسی تمام کوششیں جن کا مقصد خواتین کے حقوق کی نشان دہی اور بازیابی ہو اُسے تانیثیت کہا جاتا ہے۔

تانیثیت کی شروعات چودھویں صدی میں اٹلی میں پیدا ہونے والی اور فرانس میں پروان چڑھنے والی مصنفہ **Christine de Pizan**کی کتاب **" The City of Ladies1404**ء میں منظرِ عام پر آئی ۔اس کتاب میں مصنفہ نے خواتین کے مظالم کے حوالے سے بات کی اور انھیں کم تر خیال کرنے کی نفی کی۔ **1599**ءمیں ایک اور کتاب **ہ"پٹامیرون"(Heptameron)** شائع ہوئی جس کی مصنفہ **Marguerite de Navar** نے عورت کو کمتر قرار دینے کی مخالفت کی اور اسے تعلیم حاصل کرنے کی طرف راغب کیا۔ 1622ءمیں میری ڈی گورے نے اپنی تحریروں میں عورت کی ذہانت کو مرد کے مساوی قرار دیا اسی تسلسل کی ایک اور کڑی 1640ء میں اینی مارلے ویو نے تحصیل علم کے ضمن میں خواتین کی صلاحیتوں کو پیش کیا۔

اگر چہ خواتین کے حقوق کے حصول کے لیے چودھویں صدی میں آوازیں بلند ہونی شروع ہوئیں اور یہ سلسلہ چلتا ہوا سولھویں صدی تک پہنچ گیا ۔مگر اس کے باوجودمغرب میں باقاعدہ تانیثی تحریک کا آغاز 1791ءمیں فرانس کی قومی اسمبلی میں چارلس سوریس کے ایک تعلیمی خاکے کی پیشکش کے نتیجے میں ہوا۔اس خاکے میں تعلیم کا حق مردوں کے ساتھ مخصوص کیا گیا اور عورتوں کا کردار محض گھرداری تک محدود کیا گیا ۔اس خاکے کے مطابق مرد کا کام بنیادی اُمور کی انجام دہی ہے ۔ لہٰذا عورتوں کا کام گھر گرہستی ہے لہذا اُنھیں صرف بُنیادی تعلیم ہی دی جانی چاہیے۔ اس کے خلاف خواتین نے بھرپور مزاحمت کی ۔اسی دوران میں خواتین نے ادب کو اپنا ذریعہ اظہار بنایا اور اپنی تحریروں کے ذریعے سے خواتین کی تعلیم ، ان کے مسائل ،مظلومیت اور بنیادی حقوق کی پامالی کے خلاف کئی تحریریں لکھیں۔میری اسٹیل جو انگریزی زبان کی ادیبہ تھی ، اس نے اپنی ذہنی تنہائی کو موضوع بنایا اور ایک نظم تخلیق کی۔ لندن میں اُس نے اپنی کتاب **Thoughts on Education** لکھی اور خواتین کو اپنے ذہنی اور فنی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کی ترغیب دی۔ میری وول سٹون

کرافٹ(Marie Wollstone Craft ) نے بحیثیت تعلیم یافتہ خاتون کے لڑکیوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی. یہ سلسلہ پوری دنیا میں خواتین کے مسائل، مظلومیت اور اس کی بنیادی حقوق کی پامالی کے خلاف کئی تحریروں کی شکل میں چلتا رہا۔

**تانیثیت کے مختلف ادوار:**

1910ءکے بعد یورپ میں تانیثی نظریہ عام ہوا اور تاریخی اعتبار سے ماہرین نے اسے تین ادوار میں تقسیم کیا:

1. **پہلا دور** انیسویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے ابتدا تک۔
2. **دوسرا دور** ۱۹۴۰ءسے ۱۹۷۰ءتک جہاں خواتین قانونی اور سیاسی حقوق کے حصول کے بعد ملازمت ، گھر اور سماج میں اپنے کردار کے یقین کے لیے کوشاں رہیں۔
3. **تیسرا دور** ۱۹۹۰ء سے اکیسویں صدی کے اوائل تک کا دور ہے ۔یہ تیسرا دور ایک چوتھے دور کے آغاز کا پیش خیمہ ثابت ہوا جو 16 دسمبر 2012ء کو دہلی میں ہونے والے وحشیانہ عصمت دری کے واقعے کی سوشل میڈیا (فیس بک ،ٹوٹر ،انسٹا گرام ،ٹمبلر )پر جنسی تشدد، استحصال اور حقوقِ نسواں کی جدوجہد کا شاخسانہ بنا۔

میری وول سٹون کرافٹ کے علاوہ امریکی ادیب گریٹ ملر اور جان اسٹیورٹ مل نے تانیثیت کی بنیادیں مضبوط کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ 1843ءمیں امریکی صحافی مارگریٹ ملر کی کتاب **Women in the Nineteenth Century**(انیسویں صدی میں عورتیں) شائع ہوئی۔ برطانوی فلسفی, مفکر اور ادیب جان اسٹیورٹ مل نے **"The Subjection of the Women"**لکھ کر برطانیہ میں حقوق نسواں کی آواز بلند کی۔ اُس نے فلسفیانہ اساس کی بنا پر معاشرے میں عورتوں کو مساوی مقام دینے کی ترقی پسند سوچ پیش کی۔ اُس نے اُن تمام معاشرتی اور قانونی اُصولوں کی مخالفت کی جو عورت کو اُس کی بحیثیت انسان حقوق سے محروم کرتے ہیں۔جان اسٹیورٹ مل نے مردوں کو اپنی سوچ اور رویے میں تبدیلی لانے کی ضرورت پر زور دیا اور شادی کا مقصد زندگی کے ہر میدان میں ایک دوسرے کے شانہ بشانہ چلنے اور ذمہ داریاں بانٹنے کے عمل کو قرار دیا۔

1848 ءمیں نیویارک میں **Declaration of Rights and Sentiments**کے عنوان سے مردوں اور عورتوں کی حمایت سے متفقہ قر ارداد پیش کی گئی ۔اس قرارداد کے متن میں اس حقیقت کا انکشاف کیا گیا کہ عورت کو قدرتی ذہانت، فطانت اور عقل کے معاملے میں فروتر قرار دے کر اُسے ایسی تعلیم سے دور رکھا گیا ہے جو اُسے ڈاکٹر، وکیل ، سیاستدان یا دیگر اہم شعبوں میں کردار ادا کرنے کے قابل بناتے ہیں حیٰ کہ اُس کے ووٹ دینے کے حق کو بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

اُنیسویں صدی میں امریکہ میں غلامی کی روایت کے خاتمے کے لیے چلنے والی تحریک سے حقوق نسواں کی جدوجہد کو تقویت ملی۔ چنانچہ لوسی اسٹون( **Lucy Stone** ) ،الزبتھ کیڈی اسٹنٹن ( **Elizabeth Cady Stanton** ) اور سوزین بی (**Susan . B**)تانیثی تحریک کی علمبردار بن کر سامنے آئیں۔ ان میں سے لوسی اسٹون نے جولیا وارڈ ہو ( **Julia ward Howe** ) اور جوسفن رفین ( **Josephine Ruffin** )کے ساتھ مل کر بوسٹن میں 1869ءمیں ایک ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی ۔جسے **American Women Suffrage Association** کا نام دیا گیا ۔

انیسویں صدی میں تانیثیت ایک ایسی تحریک بن کر اُبھری جس نے حقوقِ نسواں کو اُجاگر کرنے کے لیے ادب کو ذریعہ اظہار بنایا ۔یورپ میں خواتین کے مسائل ،استحصال، پسماندگی اور مظلومیت کے خلاف آواز اُٹھائی جانے والی آوازیں بالآخر بیسویں صدی کے آغاز کے ساتھ ہی عورت کی نفسیات کو سمجھنے اور معاشی ،معاشرتی سطح پر موزوں مقام دلوانے کے لیے تخلیقی بیانیہ یا اظہار کی صورت اختیار کر گئیں۔ اس ضمن میں انگریزی ادیبہ ورجینا وولف کو تحریکِ نسواں یا تانیثی تحریک کے بانیوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اُنھوں نے عورت کو اپنی ذات کا شعور حاصل کرنے اور اپنے حقوق کے حصول کے لیے جدوجہد کا پیغام دیا۔

جنگِ عظیم اوّل کے بعد دنیا جہاں بہت سے تغیرات سے گزری وہاں سماجی ، معاشی ، سیاسی تبدیلیوں کے ساتھ **"عورت"** کے مسائل پر بھی بات کی

جانے لگی ۔ورجینا وولف کی نگارشات میں اس دور کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی دو کتابیں **The Room of One' Own** (1929ء) اور **Three Guines**(1936ء)کے اثرات 1960ء کے بعد بھی تانیثی سوچ رکھنے والے صاحب علم و فکرو دانش پر دیکھے جا سکتے ہیں۔

ورجیناوولف کے مطابق خواتین نہ صرف گھریلو زندگی میں مردوں کے زیر تسلط ہیں بل کہ اُنھیں عوامی زندگی میں بھی نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ تجارت، قانون ،تعلیم حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی ان کی ذات کی باگ ڈورمرد کے حوالے کر دی گئی ہے۔ مزید براں کسی بھی نظام پر بحث ہوبشمول سامراجی ،نوآبادیاتی یا فاشزم، عورت کی حیثیت ہمیشہ ثانوی رہی ہے۔ عورت کو احساس کمتری میں مبتلا رکھنے کا مقصد مرد کو مرکزیت دینا ہے۔ یہ تصور ادبی نظام میں بھی کار فرما دکھائی دیتا ہے۔ مردوں نے جو نسوانی کردار تخلیق کیے ان کے پسِ پُشت عورت کے کردار کو کمزور، غیر فعال اور اپنی ذات کے زیر نگیں پیش کرنا ہے۔

وولف نے اپنے ان نظریات کی پیشکش کے لیے شیکسپیئر کی بہن کا تصوراتی کردار تخلیق کیا اور یہ ثابت کیا کہ محض عورت ہونا یا نسائی چہرہ اور نسائی جسم اُس کو ادیبہ نہیں بننے دے سکا۔ ان ہی وجوہات کی بنا پر اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو قابل توجہ نہیں سمجھا گیا۔

ورجینیہ وولف نے **Androgyny** کے نظریے کو پیش کر کے انسانی کلیت کی مکمل نمائندگی کا مظہر مرد اور عورت کی سوچ و فکر پر مبنی ادیب کو قرار دیا۔ ان کے مطابق ذہن و دانش کے معاملے میں مرد اور عورت میں کوئی فطری یا پیدائشی فرق نہیں۔ کیونکہ نسل انسانی کی تخلیق کے لیے جسمانی بناوٹ کا فرق لازمی ہے۔ورجینا وولف نے کیمبرج یونیورسٹی میں خواتین کو لیکچرز دیئے اور اس بات پر زور دیا کہ اگر خواتین کو ادب کے میدان میں قدم رکھنا ہے تو انھیں خود کفیل ہونا پڑے گا اور آزادانہ ماحول میں الگ رہائش گاہ میں قیام کرنا پڑے گا ۔

ورجیناوولف نے اپنی دوسری کتاب **"Three Genies"** میں تعلیم یافتہ خواتین کو اپنے سماج کی تعمیروتشکیل کرنےاور "مرد مرکزیت" کے ڈسکورس کو چیلنج کرنے کاعندیہ دیتی ہے ۔وہ ایسے تمام احکامات اور رکاوٹوں کی شدید مخالف ہیں جن کی وجہ سے خواتین پر ادبی تخلیق کے دروازے بند کر دیے جائیں۔نیز اُنھوں نے خواتین کی ادبی نگارشات کے گمشدہ نمونے کی بازیافت ،تفہیم اور تجزیے پر بھی زور دیا ہے۔ دنیا بھر میں حقوق نسواں کی کوششیں جب مشترک اور یک زبان ہو کر سامنے آئیں تو اس کے ثمرات ملنے لگے ۔بالآخر 1944ء کو فرانس میں عورتوں کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہوا ۔ اس حق کے حصول کے پانچ سال بعد 1949ء میں فرانسیسی مصنفہ سیمون دی بوار **(Simon de Beauvoir)** کی کتاب **The Second Sex** منظر عام پر آئی ۔سیمون وجودیت کے فلسفے کے سرخیل سارتر کی بیوی تھیں ۔ اُنھوں نے خواتین کے رتبے اور کردار پر نظر ثانی کے لیے بھرپور دلائل دیے۔ اُنھوں نے عورتوں کو **Gender Stereotype** ماحول سے نجات حاصل کرنے کے ضمن میں مباحث پیش کیے ۔ان کے پیش کردہ نظریات اس عہد کے مشہور مباحث وجودیت اور تاریخ کے مارکسی تجزیے کے نقطہ نظر سے مختلف تھے۔

سیمون دی بوار کے نظریات کو دوبنیادی مباحث میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ اوّل عورت کو مرد سے الگ ایک مخصوص دائرے میں مقید رکھا گیا ہے۔ اُسے انسان کے وجود سے مبرا سمجھ کر کوئی **"غیر مخلوق"** قرار دیا گیا ہے ۔علاوہ ازیں نسائیت کا تصور مردوں کا پیدا کردہ ہے تاکہ وہ خواتین سے صنفی امتیاز برتتے ہوئے الگ اور ثانوی درجے کی مخلوق قرار دے سکیں۔سیمون دی بوار کی کتاب فرانسیسی میں لکھی گئ تاہم اس کے متعدد زبانوں میں تراجم ہوئے ۔ حتیٰ کہ ان کے نظریات نے بر صغیر پاک و ہند کو بھی متاثر کیا اور ان کی کتاب کے تراجم پاکستان میں ہوئے۔ کشورناہید نے "**عورت مرد کا رشتہ** "کے عنوان سے اس کا ترجمہ کیا اور یاسر جواد نے **"عورت"** کے عنوان سے اس کا ترجمہ کیا۔

تانیثی نظریے کی مقبولیت اور حقوق نسواں کی جدوجہد ادبی تحریک میں متشکل ہونے سے اس کا دائرہ کار وسیع تر ہوتا گیا۔اسی اثنا میں ایک مخصوص طبقہ ریڈیکل فیمینزم ( **Radical Feminism)** کے نام سے وجود میں آیالیکن اس طبقے کے نظریات انتہا پسندانہ تھے ۔اس نے عورت کے ساتھ ہونے والے استحصال اور نا انصافی کا محرک مرد کو قرار دیا۔ ان کے مطابق جبر کی مختلف شکلیں عورت کی جنسیت پر پابندیاں لگانا، جبری طور پر اس سے نسل کشی کروانا، قدامت پسند نظریہ مباشرت یعنی **Normative Heterosexuality** پر اصرار کرنا شامل ہے۔ان کے مطابق مرد نے عورت کو انتہائی چابک دستی سے اس کے دائرہ کار کو محبت،شادی ،جنسی عمل،اولاد کی پیدائش اور گھریلو کام تک محدود کردیا ہے۔ ان نظریات کی پیشکش میں نمایاں شخصیت کیٹ ملٹ **(Kate Millets)** ہیں ۔جنھوں نے صنفی تفریق اور عدم توازن کو داخلی نوآبادیاتی نظام قرار دیا ۔ان کے مطابق سماج میں مرد اور عورت کا

رشتہ عدم توازن کا شکار ہو کر دو طبقوں میں تقسیم ہو گیا ہے۔یہ رشتہ غالب و مغلوب،حاکم و محکوم اور کمزور، طاقتور پر مبنی ہے ۔جیسی کہ یہ رویہ مرد صحیفین کی تحریروں میں مردوں کی مخصوص زبان (Male Stereotype )کی نشاندہی کرتا ہے اور ان کا تخلیق کیا ادب زنِ منافرت (Misogynism)کے مواد کا حامل ہے۔

کیٹ نے خواتین کے احساس کمتری میں مبتلا ہونے کی وجوہات کا ذکر کرتے ہوئے سگمنڈ فرائیڈ ، ڈی ایچ لارنس ، ملر، نورمین ،ہیلر جین زینٹ کی تحریروں میں خواتین کی منفی کردار نگاری پر تنقید کی۔ اُس نے Androgynyکے روایتی مفہوم کو وسعت دی اور اسے نظریات اور پسندیدگی کا اجتماع قرار دیا۔

مرد مرکزذات کے مد مقابل Gynocriticism یعنی نسوانی زاویہ نگاہ کا نظریہ الین شوالٹر نے 1982ء میں وضع کیا۔ اس نقطہ نظر کی پیشکش کی حدود تاریخ، اصناف، اُسلوب ،ساختیات کے تانیثی جائزے ،موضوعات اور نسائی ادبی روایات کی شعریات و اختصاص پر مشتمل ہے۔

1983ء میں لارنس لپکنگ نے اپنی کتاب(Abandoned Women and Poetic Tradition) میں ادبی روایات میں نسائیت کے تجزیے اور مطالعے پر زور دیا اور ورجینا وولف کی طرح شیکسپیئر کی بہن کے کردار کی طرز پر ارسطو کی بہن Arimnesteکا کردار تخلیق کیا. وہ سمجھتی تھی کہ سماج اور ثقافت میں عورتوں کے کردار سے نسائی علمیات اور اس کی جمالیاتی پہلوؤں کی تشریح ممکن ہو سکتی ہے۔

تانیثیت کا دائرہ عہد بہ عہد ایک سیل رواں کی طرح نئے امکانات کے راستوں سے گزرتا ، انھیں اپنے اندر سموتا ہوا بالآخر مابعد جدید تانیثیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ یہ قدیم روایتی نظریوں جو صنفی تفریق یا مساوات کی نسبت نہ صرف خواتین کے صنفی متفرقات بل کہ اُن کی بحیثیت عورت متنوع جہات کا مطالعہ پیش کرتا ہے۔تانیثیت کا ارتقائی سفر ما بعد جدید تانیثیت کی سطح پر پہنچ کر اس کے تشخص اور وجود کی تمام جہات، اس کی متنوع صفات اور داخلی تفریق کا احاطہ کرتے ہوئے مائل فوکاٹ ، جیکس دریدا، میکس میری ایملی لکن اور سیمون ڈی بوار کے نظریات کی صورت میں منتج ہوا۔

تانیثی تحریک کا آغاز اور ارتقا فرانس کی تاریخ کا اہم حصّہ ہے۔ اُنیسویں اور بیسویں صدی میں تانیثیت کے مباحث کی روایت بھی فرانس سے جڑی ہوئی ہے۔ فرانس میں جیکسن دریدا نے تانیثی تھیوری پیش کی اور لوسی ارِی گرے (Luce iri garay)،جوڈتھ بٹلر (Judith Butter) اور گائتری چکروتی نے اس تھیوری کو ادب کا حصّہ بنایا۔ متعدد فلسفیانہ نظریات اور تحلیلِ نفسی کے نقطہ نظر سے تانیثی مباحث کی تشریح میں جولیا کرسٹوا ،ہیلن کھساؤس اور لوسی ارِی گرے کے نظریات کو منظر عام پر لانے والی کتاب New French Feminismسے مذید شہرت ملی۔ خواتین کی جنس، صنف ،جمالیات ،معروضیت کے دائروں کی تشکیل نو کی گئی۔ اسی اثنا میں دریدا کے پیش کردہ Phallogocentrismکے نظریے سے اخذ شدہ مردانہ برتری یا تفوق کو چیلنج کیا گیا۔ جولیا کرسٹوا نے عورت کی جسمانی اور عضویاتی خصوصیات کی بنا پر کمزوری کو حیاتیاتی زوجیت(Biological determinism) سے جوڑنے کی شدید مخالفت کی۔ لوسی ایری گرے نے افلاطون سے لے کر فرائیڈ تک کے فلسفیوں کو عورت کے فعال کردار کو محدود کرنے کا ذمہ دار قرار دیا۔ کیوں کہ اسی کی بنا پر عورت کو مادریت سے وابستہ ہونے کے ساتھ ساتھ عقلی اور فکری اعتبار سے کم تر قرار دے کر مرد کو کلیدی اور متحرک حیثیت دے دی گئی۔

ہیلن کھساؤس نے اپنے مضامین کے مجموعے"The Laugh of Medusa" 1975ء میں مرد اور عورت کے درمیان تفاوت کو دو زمروں میں بانٹ کر ایک کو برتر اور دوسرے کو کم تر قرار دینے کی مخالفت کی ۔علاوہ ازیں یہ بھی کہا کہ ایک زمرے کی برتری دوسرے کی کم تری کا باعث نہیں ہے ۔اُن کے مطابق مردانگی الگ اور نسوانیت کی ثنویت (Binary)نہیں ہے۔ بل کہ وہ دو جنسے(Bisexual) ہیں۔ ابتدا میں ان تمام مباحث سے ما بعد نو آبادیاتی اور تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک نابلدتھے ۔لیکن جب استعماریت کے خلاف علمِ بغاوت بلند ہوا اور حقوق کی جدوجہد شروع ہوئی تو تانیثیت کے نظریات سے آگاہی پیدا ہوئی۔ اس ضمن میں اہم نام گائتری چکروتی Gayatri Chkrovortyکا ہے۔اُن کے مضامین کے مجموعے (Can the Subulterm Speak)میں ردِتشکیل، مارکسیت اور تانیثی حوالے سے Subulterm کا بھی (دوسرے درجے یا ماتحت افسر ) جائزہ پیش کیا گیا۔ بالخصوص جنوبی ایشیا میں ذات پات، طبقاتی تقسیم، عمر، جنس اور عہدے کی بُنیاد پر برتر اور کم تر کی واضح تقسیم پر مباحث پیش کیے گئے ۔ ما بعد نوآ بادیاتی نظام میں عورت کو خاموش رہنے کی تلقین کی جاتی ہے ۔گائتری نے French Feminism in an International Frame اور Feminism and Critical Theoryمیں تانیثیت کی جامع ،مدلل تشریح کرتے ہوئے مروجہ نظریات پر تنقید کی اور ایسے

تمام قوانین ،معاشرتی نظام ،چرچ اور مرد اساس معاشرے کا محاکمہ کیا جو عورت اور مرد کے درمیان تفریق کو بڑھاتے ہیں ۔گائتری نے پہلی دنیا اور تیسری دنیا کے درمیان ثقافتی اور سماجی تفریق کو موضوع بحث بنایا اورعورت کے استحصال کے مختلف پہلوؤں کا حوالہ دے کر جبر کی مذمت کی۔ گائتری کے علاوہ چندرانا لڈے مونتی ، رامیشوری سندر راجن،لیلیٰ احمد نے بھی تانیثی تھیوری کے ارتقا میں اہم کردار ادا کیا ۔ مغرب سے وجود میں آنے والی تانیثی تحریک دو بنیادی حصّوں میں ارتقائی منزل طے کرتی رہی۔ ان میں سے ایک صنفی حقوق اور دوسرا شعر و ادب کی تانیثی قرأت پر مشتمل تانیثیت، تانیثی نظریے سے متاثر ہو کر وجود میں آنے والا ادب بھی دو پہلوؤں کو محیط ہے ۔ایک کا تعلق عورتوں کے متعلق مردوں کے لکھے گئےادب سے ہے اور دوسرا خواتین کا تخلیق کردہ ادب ہے۔

مغربی تانیثی نظریات تحریک اور رجحان دونوں پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں مگر بر صغیر پاک و ہند میں ادبی تخلیقات کے رجحان اورمزاحمتی ادب کے طور پر سامنے آیا۔ عہد بہ عہد تانیثیت کی کئی تھیوریز سامنے آتی رہیں ۔ان میں نمایا ں ایکو فیمینزم، بلیک فیمینزم، اسلامک فیمینزم وغیرہ ہیں۔ان تمام کا مرکز اور محور سماج میں عورت کے استحصال کے خلاف آواز بُلند کرنا اور حقوقِ نسواں کی آگہی عام کرنا ہے۔ سائنسی ترقی اور ڈیجیٹل میڈیا، سوشل میڈیا میں کئی ایسی جہات کا آغاز ہوا ۔

> ''فیمینزم نام ہے اس احساس کا کہ معاشرے میں پدرسری نظام مسلط ہے مادی اور نظریاتی سطح پر عورت کی محنت ،جنسیت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کا خاندان میں ، کام کرنے کی جگہ غرض پورے معاشرے میں استحصال کیا جاتا ہے اور اسے کچلا جاتا ہے اور وہ تمام مرد عورتیں جو اس حالت کو بدلنا چاہتے ہیں فیمینسٹ ہیں''۔[5]

**بر صغیر پاک و ہند میں نو آبادیاتی عہد سے قبل تصور نسواں:**

برصغیر پاک و ہند میں نو آبادیاتی نظام سے قبل مسلمان حکمران کے عہد میں اشرافیہ میں عورت کا کسی حد تک فعال کردار نظر آتا ہے۔ مثلا مغلیہ عہد میں سلطنت کے بانی بابر کی تاج پوشی گیارہ برس کی عمر میں ہوئی اور اس دوران میں تمام اُمور کے انتظام کی باگ دوڑ بابر کی نانی احسان دولت بیگم کے ہاتھ میں تھی۔ جب بابر کے خلاف امراء میں بغاوت کا آغاز ہوا تو اُن کی نانی نے ہی اس کی سرکوبی کی اور وہ اپنے نواسے کی تادم آخر مشیر رہیں۔ احسان دولت بیگم کی وفات کے بعد یہ کام ہمایوں کی بڑی بہن خانزادہ بیگم نے سنبھالا۔ علاوہ ازیں شہنشاہ اکبر نے 1581ء کو اپنے خاندان کی ایک خاتون بدرالنساء بیگم کو کابل کا گورنر( والی و حاکم) مقرر کیا اور کابل سے جاری ہونے والےفرامین پر اُس کے دستخط موجود ہوتے۔ اکبر کے دور میں ہی ایک خاتون جان بیگم کو قران پاک کی تفسیر لکھنے پر پانچ ہزار دینار بطور تحفہ ملے ۔ جہانگیر کے عہد میں ملکہ نور جہاں کی سرکاری اُمور میں عمل داری، شاہی فرامین پر جہانگیر کے ساتھ نور جہاں کی مہر اور دستخط سے عیاں ہوتی ہے ۔حتیٰ کہ اس عہد کے چاندی اور سونے کے سکوں پر اس کا نام کندہ ہے۔

مغلیہ عہد میں خواتین کے نام باغات، زمینیں، سرائیں اور جاگیریں کی گئیں۔ اس سے ثابت ہوا کہ اس عہد میں عورت کی ذاتی ملکیت کا تصور موجود تھا۔ بابر کی بیٹی اور ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کا تحریر کردہ" **ہمایوں نامہ**" مغلیہ عہد میں خواتین کے علوم و فنون پر دسترس کا ثبوت ہے ۔شاہ جہاں کی بیٹی جہاں آرا علم و فضل میں شہرت رکھتی تھیں۔ اُنھوں نے "**مونس الارواح** "کے نام سے چشتی بزرگوں کا تذکرہ لکھا ۔ شعر و شاعری سے شغف رکھنے کا ثبوت مُغل شہزادی زیب النساء کے دیوان کی صورت میں موجود ہے۔ جو اعلیٰ فارسی غزلیات پر مشتمل ہے۔ دکن کی چاند بی بی حکمران بیجا پور نے مغلوں کی یلغار پر اپنی سلطنت کا دفاع کیا ۔ انگلش فیکٹری ریکارڈ 23-1618میں شاہی خاندان کی اُن خواتین کا ذکر ملتا ہے جو ذاتی بحری بیڑے رکھتی تھیں اور سورت سے بحیرہ احمر تک کی تجارت خود کیا کرتی تھیں۔ عوام الناس کے رجحانات میں شہری آبادی کے شریف اور معتبر گھرانے اپنی بیٹیوں کو خانگی مدرسوں کے ذریعے تعلیم دلواتے تھے۔

1857ء کی جنگ آزادی کی شکست نے اس روایت کو بھی ختم کر دیا۔ اگر عوام الناس میں شعر و شاعری سے شغف رکھنے والی خواتین کو تلاش کیا جائے تو سترھویں صدی کی تاریخ میں تاج نامی خاتون برج بھاشا میں عمدہ گیت لکھتی ۔اس کے علاوہ ایک اور شاعرہ شیخ رنگریزن کا تذکرہ بھی موجود ہے جو مغل حکمران شاہ معظم کے دربار کا حصہ تھی۔ ان کے گیتوں کا مجموعہ عالم کیلی کے نام سے موجود ہے اور دونوں شاعرات کا کلام ہندی ادب کے پسِ منظر کے حوالے سے ہندوستان کی درسگاہوں میں بطور نصاب شامل ہے۔

گویا ہندوستان میں کسی نہ کسی شکل میں عوام و خواص میں خواتین کے فعال کردار کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ 1857ءکے بعد کے ہندوستان میں معاشرہ واضح تقسیم کا شکار نظر آتا ہے۔ اس عہد میں حاکم وقت فاتح اور عوام مفتوح نظر آتی ہے۔ ایک طرف تو پوری دنیا ہی تبدیلی کے عمل سے گزر رہی تھی اور دوسری طرف ہندوستان میں مغرب سے در آنے والے نظریات اور انگریزی سامراج بُنیادی معاشرتی اقدار، روایات اور ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی سعی میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ تاج برطانیہ نے مغلیہ سلطنت کے خاتمے سے قبل ایک مخصوص طبقے کی ذہن سازی کر کے اسے اپنا ہم نوا بنا لیا تھا۔

**کلیم احسان بٹ رقم طراز ہیں :**

> "اگر تاریخ پر نظر دوڑائی جائے تو معلوم ہوگا کہ 1857ء کی جنگ آزادی سے قبل ہی فورٹ ولیم کالج، دہلی کالج اور انگریزوں کی سرپرستی یا تعاون سے چلنے والی سوسائٹیوں کے ذریعے ایک ایسا تعلیم یافتہ طبقہ پیدا ہو چکا تھا جسے انگریزی حکومت کی برکات پر پورا یقین تھا اور وہ انگریزوں کے اقبال و سلطنت کے لیے دعا گو تھا۔"(6)

گویا اسی عہد میں تمام شعبہ ہائے زندگی انگریز سرکار کے مرکز کے گرد رواں دواں تھے۔ مغربی نظریات برصغیرِ پاک و ہند میں معاشرتی، سیاسی، معاشی ، تعلیمی اور ادبی رجحانات کو متاثر کر رہے تھے۔ اس عہد میں ہن‌دوستان تانیثیت کے نظریات سے متعارف ہوا اور مروجہ تصورِ نسواں میں تبدیلی کا عمل شروع ہوا۔

**ڈاکٹر ناصر عباس نیر رقم طراز ہیں:**

> "1857ءنے ہماری تاریخ کوہی نہیں ہماری تاریخی شعور کو بھی بدل کر رکھ دیا ۔اس کے بعد ہم نہ صرف نئے عہد میں داخل ہوئے بلکہ خود کو اور اوروں کو نئے زاویوں سے دیکھنے لگے اور یہ نئے زاویے ہم نے خود تخلیق نہیں کیے تھے۔ نئ تاریخ نے یہ ہمیں تھما دیے تھے "۔ (7)

### نو آبادیاتی عہد میں تحریک علی گڑھ اور تصور نسواں کا ارتقا

تانیثیت کی اصطلاح مغرب میں متعارف ہونے والی تحریک **Feminism** کا اُردو ترجمہ ہے ۔اس اصطلاح کو مشرق اور مغرب کے تمام معاشروں میں اُس کی اپنی روایات ،تہذیب اور ثقافت کے مطابق قبول کیا گیا۔ تانیثیت بحیثیت مجموعی خواتین کے ساتھ روا رکھے جانےوالے امتیازی سلوک کی مذمت اور اُنھیں انسان کی حیثیت سے تمام حقوق دلوانے کی ایک کاوش یا تحریک قرار دیا گیا۔

برصغیر پاک و ہند میں نوآبادیاتی عہد کے دوران فیمینزم کی تحریک کے اثرات پہنچے ۔برصغیر پاک و ہند ایک ایسا خطہ ارض ہے جہاں مختلف عقائد ، تصورات ،روایات ،مذاہب، لسان اور معاشرتی اقدار کے عروج و زوال کی تاریخ موجود ہے۔

آریاؤں کے زیر اثر سماج میں عورت کو دیوی کے طور پر پوجا تو گیا مگر معاشرے میں اسے کبھی مکمل انسانی حقوق نہیں دے گئے۔ اُسے پست وجود قرار دے کر عقل و دانش کے اعتبار سے کمتر سمجھ کر فیصلہ سازی میں اُس کا کردار محدود کر دیا گیا۔ اُس کی ذات سے مختلف فرسودہ اور باطل نظریات وابستہ کر دیے گئے۔ شادی کی صورت میں باپ بیٹی کا کنیادان کرتا یعنی شوہر کو دان کر دیتا، بیٹا پیدا نہ ہونے کی صورت میں اسے طعن و ملامت کا نشانہ بنایا جاتا، اولاد کی پیدائش نہ ہونے پر بانجھ، بیوہ کو منحوس حتی کہ شوہر کی چِتا کے ساتھ جلا کر زندہ جلا کرستی کیا جاتا ۔جائیداد میں اس کا کوئی حق نہ تھا۔ یہ چلن صرف ہندوستان میں ہی نہ تھا بل کہ دنیا کے طول و عرض میں حتی کہ یونانی فلاسفر کے افکار میں عورت کمتر سمجھی جاتی تھی۔ لہذا اتنی توانا تاریخی روایات کے اثرات ہندوستانی معاشرہ کیسے نظر انداز کر سکتا تھا۔

برصغیر میں جب مسلمانوں نے اقتدار حاصل کیا تو اسلام اور دیگر ملکوں میں رائج تصورات اور نظریات مقبولیت حاصل کرنے لگے۔ عورت کو اُس کے چھیپے گئے چند حقوق میسر آنے لگے۔ یہاں یہ نقطہ اہم ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کی اکثریت ہندی نژاد تھی لہذا ان کے ذہنوں کو بدلنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ چنانچہ فیمینزم ،تانیثیت کے نظریات کی شد و مدسے مخالفت کی گئی حی کہ خواتین کی طرف سے بھی شدید تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ اسے مغرب زدگی، بے جا

آزادی اور معاشرتی روایت کی نفی قرار دیا گیا۔ علاوہ ازیں مذہب کی آڑ لے کر خواتین کو پردہ کرنے اور گھر کی چار دیواری تک محدود کر کے ان کے سماجی کردار کی نفی کی گئی۔ عورت کا کام صرف مردوں کی جنسی تسکین ،تولیدِ نسل اور گھریلو کام کاج تک محدود تھا اِس کی زندگی کے فیصلے کرنے کا مکمل اختیار مرد کے پاس تھا۔

فیمینزم کا نظریہ ہندوستانی سماج کی بُنیادی اساس سے براہِ راست ٹکراؤ کا حامل تھا۔ اگرچہ یہ نظریہ مادی اور وجودی حیثیت سے عورت کے کردار، جنسیت اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے ٹکراؤ نہیں رکھتا تھا بل کہ اس تمام عمل میں اُس کے ساتھ کیے جانے والے استحصال کی مکمل مخالفت تھا۔ فیمینزم کا نظریہ صنفی تقسیم کو رد کر کے ہر اُس مرد اور عورت کی حمایت کرتا تھا جس کے حقوق غصب کر کے اُس کی بطور انسان تحقیر یا تذلیل کی جاتی ہو۔

فیمینزم کی ابتدا ہندوستان میں برہمو سماج **1830ء**، میں رام موہن رائے نے رکھی، آریہ سماج کی بنیاد **10 اپریل** 1 **875 ء** کو سوامی دیانند نے قائم کی، **1880ء** میں تھیوسوفیکل سوسائٹی کا آغاز ہوا جس کا اہم مرکز 1882ء میں اڈیار اور مدارس میں قائم ہوا تھا ،کے ذریعے عورتوں کی تعلیم اور آزادی کی صورت میں ہوئی۔ ان تمام رسومات کے خلاف آواز بُلند کی گئی جہاں عورتوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنانے کے علاوہ شوہر کی موت کی صورت میں اُس پر زندگی کے دروازے بند کر دیے جاتے اور اسے ستی کر دیا جاتا ۔ اسی دوران میں 1857 ء کے بعد **سرسید احمد خان** نے علی گڑھ تحریک کی صورت میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے جدوجہد کا آغاز کیا ۔مگر اس میں عورتوں کو نظر انداز کر دیا گیا ۔

> 1857 ء کے بعد سر سید نے ہندوستان خاص طور سے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں میں تجدد کی تحریک شروع کی مگر اس سے عورتوں کو بالکل الگ رکھا۔ اس لیے کہ ان کے ذہن میں عورتوں کے مقابلے میں مردوں کی برتری اور اہمیت کا خیال بیٹھا ہوا تھا ۔وہ اس سوال پر کہ عورتوں کے لیے بھی تعلیم ضروری ہے اور ان کو زمانے کو بدلنے کی ضرورت ہے ، کبھی تو یہ جواب دیتے کہ جس ملک میں مردوں کی اتنی ابتر حالت ہے اس میں عورتوں کی ترقی اور تعلیم کا کیا سوال ہے۔ جب عورتوں نے ان سے اس کی شکایت کی تو اُنھوں نے یہ جواب دیا '' میری پیاری بہنو "،یقین مانو دُنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت "درست ہو گئی ہو۔" (8)

**مولوی ممتاز علی** جو تحریک آزادی نسواں کے بہت بڑے داعی تھے، اُنھوں نے خواتین کی تعلیم اور اُن کے حقوق پر کتاب لکھی اور سرسید احمد خان کو دکھائی مگر سرسید نے نہ صرف اُن سے ناراضی کا اظہار کیا بل کہ اُس مسودے کو بھی پھاڑ ڈالا۔

سرسید احمد خان جب انگلستان کا سفر کرتے ہیں تو وہاں خواتین کی علمیت اور علمی شعبے میں اُن کی شمولیت کی تعریف کرتے نہیں تھکے۔ مزید یہ کہ ہندوستان میں عورتوں کی تعلیم کے لیے کوشش نہ کرنے پر توجیہ پیش کرتے ہیں کہ مردوں کے تعلیم یافتہ ہونے تک ایسی کوششیں معاشرے کے لیے مضر ثابت ہوں گی ۔سر سید نے کبھی بھی خواتین کے حقوق یا عملی زندگی میں اُنھیں متعارف کروانے کی کسی کوشش کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ جب بھی اس معاملے پر اُن سے بات کی جاتی تو وہ پہلو تہی کرتے ۔ **اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں :**

> ''امریکہ یورپ کی حالت معاشرت کے خیال سے شاید وہ علوم لڑکیوں کے لیے ضروری ہوں ۔وہاں عورتیں پوسٹ ماسٹر اور ٹیلی گراف ماسٹر یا پارلیمنٹ کی ممبر ہیں۔ ہندوستان میں یہ زمانہ سینکڑوں برس بعد بھی آنے والا نہیں''۔ (9)

یہ تحریر سر سید کی برصغیر کے مردوں کی اکثریت کی سوچ کی نمائندگی کرتی ہے۔1857ءسر سید احمد خان نے تحریک علی گڑھ کے مرکز پر اپنے زمانے کے زرخیز اور ذہین افراد کو علمی اور ادبی زریعہ اظہارسے اپنا پیغام پہنچانے کے لیے منتخب کیا ۔اُنھوں نے دورہ انگلستان کے بعد "**تہذیب الاخلاق** "رسالے کا اجرا 1870 ءمیں کیا تاکہ قوم کی اصلاح کی جا سکے ۔لیکن خواتین کے حقوق اور نئے اُبھرتے ہوئے معاشرتی تناظر میں اُن کے جدید کردار کے لیے کوئی قدم نہیں اُٹھایا۔ اُن کی تحریک سے وابستہ دیگر اربابِ علم و فکرو دانش جن میں مولوی نذیر احمد، مولانا شبلی نعمانی اور سرفہرست مولانا حالی نے تانیثیت کو اپنے

عصری آئینے میں دیکھتے ہوئے خواتین کے بُنیادی حقوق کے لیے آواز بلند کی۔ اس مقصد کے لیے شعرو ادب کی مختلف اصناف کو ذریعہ اظہار بنایا اور جہاں تک ممکن ہو سکتا تھا عملی طور پر بھی اس میں دامے درمے قدمے سخنے اپنا اپنا کردار ادا کیا۔

علی گڑھ تحریک سے ہٹ کر فیمینزم ،تانیثیت کے حق میں مختلف علمی ادبی حلقوں سے آوازیں بلند ہوتی رہیں۔ عہد میں فیمینزم ایک حقوق نسوا ں تحریک کے علاوہ نسائی ادب کے ارتقا کا باعث بھی بنی۔

جس کی مثال رتن ناتھ سرشار کا '' **فسانہ آزاد** '' ہے جوپہلی فیمینسٹ خاتون کا کردار پیش ک‌رتا ہے ۔حسن آرا اور اُس کی والدہ کے مابین شادی کے موضوع پر ہونے والی گفتگو لڑکی کی رائے اور پسند کے حق کو تقویت دیتی ہے۔ اللہ رکھی کا کردار ایک بہادر اور زمانہ ساز خاتون کی نمائندگی کرتا ہے جو کسی سے بھی ناانصافی پرآنسو بہانے کی بجائے عدالت کے ذریعے اپنا حق لینا جانتی ہے۔اس ضمن میں شریف زادہ سے ایک اقتباس مُلاحظہ کیجئے۔

''ذکور ہمیں کس قدر برا سمجھتے ہیں اور کس قدر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں لیکن قصور مردوں کا ہے جو ہمیں تعلیم نہیں دینا چاہتے (عورتیں) اگر پڑھی لکھی ہوں تو مکالمہ کر کے ثابت کر دیں کہ عورتیں زیادہ خوش وضع اور دانشمند ہیں''۔ (10)

اُنیسویں صدی کے اختتام تک مسلمانوں میں ایک مہذب اور روشن خیال طبقہ پیدا ہو چکا تھا جس کو یہ احساس تھا کہ عورت کو صنفی امتیاز کا نشانہ بنا کر اُس کے بنیادی حقوق غصب کیے جا رہے ہیں۔ مولوی نذیر احمد کے لکھے ناول فیمینزم یا تانیثیت کے رحجان کو ارتقا بخشتے ہیں۔ '' **فسانہ مبتلا** '' کثرت ازدواج کے رویے کی حوصلہ شکنی کرتا ہے ۔ایامٰی کی آزادبیگم بیوہ ہے مگر وہ دوسری شادی کی متمنی ہے۔ اگرچہ مولوی نذیر احمد نے بیوہ کی شادی کو ناول کا حصہ نہیں بنایا مگر بیوہ عورت کے عقدِ ثانی کے حق کو تسلیم ضرور کیا ہے۔ علاوہ ازیں **"مراۃ العروس "**اور **"بنات النعش "**جیسے ناولوں میں خواتین کے حقوق اور تعلیم پر زور دیا۔

مولانا شبلی نعمانی خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے قائل تھے ۔وہ اس بات پر معترض تھے کہ خواتین کو مخصوص نصاب پڑھایا جائے اور اسے محدود کردار تک م عاشرے کا حصہ بننے کی آزادی دی جائے ۔اُنھوں نے بیگم عطیہ فیضی کو خواتین کےحقوق بالخصوص حصول علم کے لیے تحریک چلانے کی دعوت دی اور اپنے دیگر احباب کو اس کار خیر میں حتیٰ المقدور حصّہ ڈالنے کے لیے مراسلے لکھے۔

مولانا شبلی خواتین بالخصوص مسلم خواتین کو زمانہ ساز، حوصلہ مند اور عصری تقاضوں کے مطابق دیکھنا چاہتے تھے ۔اُن کے مطابق مرد اور عورت کے لیے یکساں تعلیم اور نصاب ہونا چاہیے تاکہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور کوئی ایک دوسرے کو کم تر یا کم حیثیت نہ سمجھے۔ وہ خواتین کو دھان پان یا چھوئی موئی دیکھنے کی بجائے ، جمال اور جلال کا امتزاج دیکھنے کے خواہاں تھے۔

**مولانا جبیب الرحمان شیروانی کے نام مولانا شبلی ایک خط میں رقم طراز ہیں:**

'' بمبئی میں عورتوں کے جلسے دیکھے ان کی تقریریں سنی، اُن کی قابلیت دیکھی لیکن چنداں خوشی نہ ہوئی کیونکہ ان کی سرگرمیوں میں مسلمان عورتوں کا کہیں پتہ نہ تھا''۔ (11)

عبدالحلیم شرر کے معاشرتی ناول ہندوستانی معاشرے میں خواتین پر لگائی گئی پردے کی بے جا پابندیوں اور بغیر دیکھے صرف بڑوں کی مرضی سے کی جانے والی شادیوں کی مذمت کرتے ہیں ۔شرر حقوقِ نسواں کے ضمن میں تعلیم کو عورت کا بنُیادی حق سمجھتے ہیں اور جدید تعلیم کے علاوہ انگریزی تعلیم کے حق میں قلم فرسائی کرتے ہیں۔ یہ وضاحت کرتے ہیں کہ انگریزی یا جدید تعلیم انسان کو شعور دیتی ہے اُسے بے دین نہیں کرتی۔

مولانا حالیؔ کے عہد میں حقوقِ نسواں کے لیے خواتین بھی میدان میں نکل آئیں اور اُن کے ساتھ اُس عہد کے روشن خیال اور تعلیم یافتہ مرد بھی شانہ بشانہ جدوجہد میں شریک رہے۔

برصغیر پاک و ہند میں علی گڑھ کے تعاون اور مدد سے تحریکِ حقوقِ نسواں کو تقویت ملی۔ س تحریر کو تقویت دینے میں سید امیر علی کی شخصیت بھی نمایاں

ہے جنھوں نے انگریزی میں دو کتابیں **The legal position of Women in Islam**(1912) اور **The staus of women in Islam** جیسی کتاب تحریر کر کے بر صغیر پاک و ہند کے قدامت پسند اور انگریز سرکار کو اسلام کی طرف سے دیے گئے حقوق نسواں سے روشناس کروایا۔ایک جاندار علمی اور ادبی جدوجہد نے معاشرے میں نئے تصور نسواں کو متعارف کروانے کا آغاز کیا۔ اس سلسلے کی ایک کڑی مولوی ممتاز کا ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ جلسے میں شعبہ تعلیمِ نسواں کا سیکرٹری بننا تھا۔ خواتین کی تعلیم کے معاملے میں سر سید کی طرف سے مولوی ممتاز علی نے حوصلہ شکنی کی وجہ سے اُن کی حیات میں کھل کر آواز بلند نہ کی مگر اُن کی وفات کے بعد اُنھوں نے خواتین کی تعلیم اور حقوق کی جدوجہد میں متحرک کردار ادا کرتے ہوئے ایک رسالہ "**تہذیب نسواں** "ہفت روزہ یکم جولائی 1898 میں جاری کیا علاوہ ازیں مولانا حالؔی کی مشاورت کے نتیجے میں ایم۔ اے۔او کالج کا رسالہ علی گڑھ منتقلی نومبر 1903 ءکا شمارہ خواتین سے منسوب کیا گیا۔ "**تہذیبِ نسواں** "کے اجرا نے اس عمل کو مزید آگے بڑھایا اور خواتین کے حقوق کی آواز بلند کی۔ علاوہ ازیں اُن کو معاشرے میں درپیش مسائل کوببانگ دہل پیش کیا۔ ڈاکٹر حمیرا اشفاق اور غزل یعقوب اپنے مضمون برصغیر کی سماجی صورتحال کے تناظر میں تہذیب نسواں کی مضمون نگار "**خواتین کا نسائی شعور**'' میں رقم طراز ہیں:

> ''تہذیبِ نسواں کی مضمون نگار خواتین نے ہندوستانی عورت ،تعلیم، ازدواجی زندگی سے متعلقہ مسائل ،شادی کے معاملے میں لڑکی کی پسند ناپسند کا اختیار، خلع اور طلاق سے متعلقہ مسائل، بیوہ کے لیے بنائے گئے اُصول، وراثت اور جائیداد میں حصہ ،اقتصادی ترقی میں عورت کا کردار، عورت کی سماجی زندگی کے ذیل میں پردے کے مباحث ، آزادی اظہار اور سیاسی معاملات و مسائل کے حوالے سے ان کے حقوق کے بارے میں لکھا''۔(12)

گویا جدید تانیثی تصورات برصغیر پاک و ہند کے سماج میں قبولیت حاصل کر کے خواتین کے مذکورہ بالا حقوق کی آواز بن گئے۔ مغربی نسائی تحریک کے زیر اثر حقوق نسواں اور نسائی شعور کا منبع وماٰخذ حصولِ علم کے بنا ادھورا قرار دیا گیا انسائیت کے بنیادی لوازمات میں اصلاحِ معاشرہ، روشن خیالی، ترقی پسندی اور انقلابی اقدامات شامل ہیں ۔ لہٰذا خواتین کو قومی میدان عمل میں اُترنے اور زیور تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنے حقوق کی جدوجہد کرنے کا عندیہ دیا گیا۔

تانیثی تحریک نے ادب کو وسیلہ اظہار بنایا اور مولانا حالی کے عہد میں علامہ راشد الخیری نے ''**نوحہ زندگی** ''،'' **صبح زندگی** '' جیسے فن پارے تخلیق کر کے نسائی ادب کو فروغ دیا۔ سجاد حیدر یلدرم کے فن پارے ،ڈاکٹر رشید جہاں کا افسانہ'' **دلی کی سیر**'' ، محمدی بیگم کا جاری کردہ تہذیب نسواں ،علی گڑھ سے جاری ہونے والا ماہنامہ'' **خاتون** '' نسائی شعور کی توانا آواز بنے۔ ماہنامہ'' **عصمت**'' کے مدیر شیخ محمد اکرم نے اپنی بیگم( نائب مدیرہ) کے ساتھ مل کر قدر بِمقدور اس کاوش میں حصّہ ڈالا۔ لکھنو سے مولانا عبدالحلیم شرر نے" **پردہ عصمت** ''جاری رکھا۔ لاہور اور امرتسر سے ''**سہیلی**'' رسالہ جاری ہوا۔ نو آبادیاتی عہد میں خواتین کے حقوق کی تحریک برصغیر پاک و ہند کے طول و عرض میں پھیل گئی۔**ڈاکٹر جمیل جالبی کے مطابق**'' **اُردو میں جرائد نسواں کی تاریخ**''آزادی سے قبل خواتین کے ایک سو جرائد اور رسالوں کا اجرا ہوتا تھا جن میں حقوقِ نسواں کے علاوہ خواتین کی تعلیم کے ضمن میں مواد چھاپا جاتا تھا۔

تانیثی تحریک کی حمایت میں اضافے نے مولانا اشرف تھانوی جیسے نقطہ نظر کو رد کر دیا۔ جن کے مطابق عورت کو تعلیم دلوانے سے وہ عشقیہ خط لکھے گی ۔مولانا اشرف کے مطابق عورت صرف اس قدر تعلیم کے قابل ہے کہ وہ دھوبی کا حساب رکھ سکے ۔یہی وجہ تھی کہ مولانا اشرف تھانوی کی تحریر کردہ کتاب ''**بہشتی زیور**'' کی بھر پور حوصلہ شکنی کی گئی۔

نو آبادیاتی عہد کے دوران میں تصور نسواں اور تانیثی تحریک کے معاملے میں معاشرے میں واضح تقسیم نظر آتی ہے ۔ایک طبقہ مختلف حیلوں بہانوں سے خواتین کو گھر کی چار دیواری تک محدود کرنے اور پدرسری نظام کی بقا کے لیے سرگرم عمل نظر آتا ہے۔دوسرا طبقہ انگریز سرکار کی حمایت اور ذہنی غلامی کی وجہ سے احساس کمتری میں مبتلا ہو کر اپنی معاشرتی اقدار سے بغاوت پر آمادہ ہے ۔ تیسرا طبقہ معتدل مزاج ہونے کے سبب اپنی تہذیب و تمدن ثقافت اور پہچان کو برقرار رکھتے ہوئے معاشرے میں جدید تقاضوں کے پیشِ نظر خواتین کو اُن کے حقوق دینا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان تینوں طبقات میں صنفی امتیاز کی بنا پر حقوق نسواں کی حمایت یا مخالفت شامل نہیں بلکہ اصل وجہ شعور اور ذہنی کیفیات ہیں ۔

اسی دوران میں روایتی خیالات کی حامل خواتین بھی حقوق نس‌وا ں کی مخالفت میں اسی طرح پیش پیش تھیں جس طرح اس عہد کے مرد عورت کو صرف دینی تعلیم دے کر تربیت اولاد، گھریلو کام کاج تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔وہ اس معاملے میں پردہ کی پابندی کی آڑ میں ہر اُس کوشش کی مخالف تھیں جس کی بنا پر جدید تصورنسواں کا حصول پروان چڑھ سکے ۔ یہی وجہ تھی کہ مولوی محب حسین کو ایک رسالہ" **معلم نسواں** "جاری کرنا پڑا جس میں مولوی محمد نے ایسے پردے کو جو خواتین کو اُن کےبنیادی حقوق سے محروم رکھے " **حبس دوام** "کا نام دیا۔

اگرچہ اُن کے رسالے کی مخالفت اتنی شدید ہوئی کہ اُنھیں وہ رسالہ بند کرنا پڑا مگر حقوق نسوا ں کی تحریک اتنی توانا ہو چکی تھی کہ اُسے دبانا ممکن نہ تھا۔

تصور نسواں کے حوالے سے سر سید احمد خان ،اکبر الہ آبادی اور علامہ اقبال ایک مخصوص مکتبہ فکر رکھتے ہیں۔

علامہ اقبال عورت کو بقائے نسل اور تشکیل معاشرہ تک محدود کر کے زن اور ن‌ازن کی بحث پیش کرتے ہیں۔ اقبال اپنے عہد کے پیش کردہ مغربی تصورِ نسواں سے نالاں دکھائی دیتے ہیں ۔ان کے مطابق مرد اور عورت کی مادی حیثیت بحث کے قابل نہیں۔ علاوہ ازیں وہ سیکولر تعلیم کو ہندوستان کی خواتین کے لیے غیر مناسب اور نقصان دہ سمجھتے ہیں ۔محمد احمد خان "**اقبال اور مسئلہ تعلیم**" کے باب نمبر 10 میں علامہ اقبال کے نظریات کو ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

> " دوسرے لفظوں میں عورت کی سیکولر تعلیم کے معنی یہ ہیں کہ ایک ایسے ادارے **Constitution** کو دین سے بیگانہ و بے بہرہ کر دیا جائے جو افراد ،خاندان ،معاشرہ اور قوم کی تعمیر بھی کر سکتا ہے اور تخریب بھی۔ لیکن یہ ادارہ فکری لحاظ سے "دین "سے بیگانہ ہو جائے گا تو اس سے تخریب کا عمل ہی جاری رہے گا وہ ایک" فکری قوم" جس کی بنیاد ی اساس ہی دین ہے تعمیر نہیں کر سکے گا۔ یہ ادارہ نقطہ کشش و اجتماع نہیں مرکز فشارو انہشار بن جائے گا ،اسی لیے ایک بار اس ادارہ "مدرسہ زن "کے بیگانہ دین ہو جانے کو عشق و محبت کی موت قرار دیتے ہیں کہ عشق و محبت ہی مسلمان جیسی فکری قوم کی شیرازہ بند ہے"۔ (13)

علامہ اقبال کی حکیمانہ سوچ جدید تصور نسواں سے مختلف ہے ۔کیوں کہ عورت کو سیکولر تعلیم نہ دینے کی دوسری صورت ایک ایسا نظام تعلیم، نصاب اور معاشرتی کردار لازمی ہے جو بدلتے ہوئے حالات سے مطابقت رکھتا ہو۔ نو آبادیاتی عہد میں ایسا کوئی لائحہ عمل نظر نہیں آتا ۔دوسری بات یہ کہ علامہ اقبال خود بھی تو مغربی تصورات سے واقف اور مغربی تعلیم سے آراستہ تھے۔ اگر ان سے اُن کا ذہن بیگانہ دین نہیں ہوا تو خواتین کو جدید تعلیم یا تصورات سے خطرات کیوں کر لاحق ہو سکتے ہیں ؟ جس آئیڈیل معاشرے اور قوم کی خاتون کے لیے اقبال کے تصورات قابل عمل ہوں وہ حقیقی طور پر اُن کے عہد میں موجود ہی نہیں ۔اقبال دین میں اجتہاد کے داعی رہے مگر خواتین کے حقوق کے معاملے میں قدامت پسندی کی وجوہات کی کوئی منطقی بنیاد نہیں نظر نہیں آتی کیوں کہ خواتین کے کردار کو محدود کر کے وہ معاشرہ وجود میں نہیں آ سکتا جس کا تصور علامہ اقبال نے پیش کیا ۔چناچہ اگر خواتین ڈاکٹر، وکیل ،اُستاد بننا چاہتی ہیں تو وہ زن سے نازن نہیں ہو جائیں گی۔کیوں کہ ا گر دینی تعلیم انسانی کردار کی روحانی تکمیل کے لیےساتھ لازم ہو تو معاشرے میں متحرک مثبت اور سودمند کردار ادا کر سکتی ہیں۔

نو آبادیاتی نظام میں جکڑا ہوا مرد حصولِ آزادی کی تگ و دو کرتا دکھائی دیتا ہے اور اپنے بنیادی حقوق کی جنگ لڑ رہا ہے، ان حالات میں علامہ اقبال کی خواتین کی تعلیم کے لیے الگ تعلیمی نصاب کی تشکیل اور مخلوط تعلیم کی مخالفت کر کےآزاد یونیورسٹی کے قیام کی تجویز قابل عمل نہیں ہو سکتی تھی۔ چناچہ اقبال کی زندگی میں نہ تو ایسا نصاب تشکیل دیا گیا جو خواتین کو مذہبی تعلیم دے سکےیا اس کے بعد اسلامی تاریخ ،علم تدبر خانہ داری ،اُصول حفظ و صحت کے مضامین کی تدریس ممکن بنا سکے۔ اورایسی کوئی آزاد یونیورسٹی بھی قائم نہ ہو سکی ما سوائے مسلم گرلز ہائی سکول اور انٹرمیڈیٹ کالج کے۔

علامہ اقبال کے عہد میں آزادی اور پھر مسلمانوں کے الگ وطن کی خواہش نے مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ قائدِاعظم محمد علی جناح کی سربراہی میں تحریک پاکستان میں خواتین کا بھرپور کردار سامنے آیا۔ اس ضمن میں قائد اعظم کی سوچ کھل کر سامنے آتی ہے کہ مسلم لیگ میں خواتین کی شمولیت الگ مملکت کی جدوجہد میں لازمی ہے ۔چنانچہ 26 اپریل 1923ء کو دہلی میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں خواتین کے نام مسلم لیگ ونگ میں شامل کیے گئے ۔ قائدا

عظم نے 1944ء کی تقریر میں کہا:

''یہ انسانیت کے خلاف ایک جرم ہے کہ ہماری عورتیں گھروں کی چار دیواری میں قیدیوں کی سی زندگی گزاریں ۔ہماری عورتیں جن شرمناک حالات میں زندگی گزارنے پر مجبور ہیں اس کا کوئی جواز موجود نہیں ہے ۔آپ اپنی عورتوں کو زندگی کے ہر شعبے میں کامریڈ کی طرح ساتھ ساتھ لے کر چلیں''۔
(14)

اسی عمل کے نتیجے میں تحریک پاکستان کی جدوجہد میں کئی خواتین کے نام تاریخ میں حصّہ بن گئے۔ ان میں نمایاں محترمہ فاطمہ جناح ، بیگم لیاقت علی خان ،بیگم شاہ نواز، سلمیٰ صدیق حسنین ،لیڈی ہارون ،شائستہ اکرام اللہ، نور الصبح بیگم اور کئی ایسی معتبر شخصیتیں اور لاہور سیکٹریٹ پر مسلم لیگ کا پرچم لہرانے والی صغری بیگم کا نام شامل ہے۔ خواتین نے تحریک پاکستان میں جلسے جلوس نکالے، پولیس کا مقابلہ کیا، ظلم برداشت کیے اور 1947ء میں ہجرت کے مظالم سہے اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کیے۔

**قیامِ پاکستان کے بعد تانیثی تصورات**

تحریک پاکستان کے دوران قائد اعظم نے خواتین کے سیاسی کردار کو پاکستان کے قیام کی جدوجہد میں شامل کر کے واضح کر دیا کہ مملکت خداداد کی ترقی خواتین کے متحرک اور فعال کردار کی بنا ممکن نہیں۔ چنانچہ 1947ء سے لے کر تاحال مختلف مکاتبِ فکر کاتانیثیت کے بارے میں رائے یا نکتہ نظر میں اختلاف پایا جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرہ خواتین کو اُن کے بنیادی حقوق دینے کے معاملے میں آج بھی تقسیم کا شکار ہے۔ پاکستان کی 70 فیصد آبادی کا تعلق دیہات سے ہے ۔بقیہ 30 فیصد جو بڑے شہروں میں آباد ہیں لیکن تصور نسواں کے حوالے سے پذیرائی حاصل تھی۔پاکستان میں دینی اِداروں اور مدرسوں میں طلبہ کی کثیر تعداد زیر تعلیم ہے ۔ان سے فارغ تحصیل ہونے والی نسل عورت کے اُسی کردار کی حامی ہے جو بطورِ نصاب ہر فرقے نے اپنے طور پر متعین کیا ہے۔ دوسرا ماڈرن جدید فیشن زدہ طبقہ پرائیویٹ یا نجی اداروں، کالج، یونیورسٹیوں سے فارغ التحصیل ہو کر سامنے آتا ہے۔ وہاں بھی افراط اور تفریط کی کیفیت ہے ۔حقوق نسواں کے ضمن میں معاشرہ واضح طور پر تین حصوں میں منقسم ہے۔

1۔**مغرب پسند طبقہ**: جو کہ مغربی تصورات سے اتنا متاثر ہوا ہے کہ ایسی آزادی کی خواہش میں مبتلا ہے کہ جس کی کوئی حدود و قیود نہیں ہے۔

**:2روایت پسندطبقہ** : جہاں معاشرتی رسم و رواج اور خاندانی بزرگوں کی رائے معتبر دی جاتی ہے۔ خواتین کو ملازمت کرنے کی اجازت بھی بعض اوقات حالات اور فکری یاشعوری طور پر وسیع النظری کے تحت دی جاتی ہے۔ دیگر حقوق کے حصول میں بھی ملا جلا رجحان ہے ۔

**:3کٹر مذہبی طبقہ**: یہ انتہا پسنداعتقادات کا حامل ہے جو پردہ ،شریعت (اپنے مطابق) اور دیگر قدغن لگا کر عورت کو چار دیواری تک محدود کر کے مرد کی واضح بادشاہی قبول کرتا ہے۔

موجودہ عہدمیں خواتین کے بنیادی حقوق جن میں تعلیم، ازدواجی زندگی سے متعلقہ معاملات ،عائلی زندگی، طلاق یا بیوہ کے معاملات، معاشی مسائل، وراثت میں لڑکے کا حصہ، حق مہر کی ادائیگی، اقتصادی، سیاسی ،معاشی میدان میں خواتین کی شمولیت، پردے کے احکام یا مذہبی روایات کے تحت معاشرتی حدود بندی وغیرہ کے بنیادی مباحث آج بھی ماضی سے مختلف نہیں ہیں ۔ پاکستانی معاشرے کا محور آج بھی مرد کی ذات ہے ۔خواتین کے لیے اپنے حقوق حاصل کرنے کی جدوجہد تاحال بھی آسان نہیں ۔معدودے چند فیصد آبادی کے جہاں خواتین کو بحیثیت انسان دیکھا جاتا ہے ۔آج بھی خواتین کی کثیر آبادی اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہے اور اسے صنفِ ثانی قرار دیا جاتا ہے۔

تانیثی تصورات کی ترسیل کا قیام پاکستان کے بعد بھی مختلف نشیب و فراز کا سامنا کر رہا ہے۔

**پروفیسر حامد کاشمیری رقم طراز ہیں :**

> ’’ موجودہ عہد تک آتے آتے عورت کو تولید دیگرے کے عمل سے گزرنا پڑا اور اسے اپنے ہونے کا احساس کرنے اور احساس دلانے کے لیے بڑے بڑے کٹھن مراحل سے بھی گزرنا پڑا ہے ۔حالیہ برسوں میں اس نے جو کچھ لکھا ہے اور خاص کر جو کچھ اس وقت لکھا جا رہا ہے اس کے وجود کی تخلیقی اور سماجی اثباتیت کی طرف اشارہ کناں ہے‘‘۔(15)

اُنیسویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کے آغاز میں اُردو ادب میں نسائی شعور کی جھلکیاں واضح دکھائی دیتی ہیں۔ مغرب سے آنے والے تانیثی تصورات نے بنیادی معاشرتی ڈھانچے میں تبدیلی کے علاوہ ادبی رجحانات پیداکیے ۔بیسویں صدی کے ابتدائی سالوں میں تعلیمی اور تخلیقی سرگرمیوں میں خواتین کی نمایاں شمولیت دکھائی دیتی ہے۔ لاہور سے محمدی بیگم (والدہ امتیاز علی تاج )نے **"تہذیب نسواں"** کا اجرا 1898ءمیں کیا۔ علی گڑھ سے ماہنامہ" خاتون"1938ءمیں جاری کیا گیا۔ یہ رسالہ شیخ عبداللہ اور اُن کی اہلیہ بیگم عبداللہ کی مسلمان لڑکیوں کو تعلیم کی طرف راغب کرنے کی ایک کڑی تھا۔ بعد ازاں190 6ء میں علی گڑھ میں لڑکیوں کا پہلا سکول قائم کرنے میں یہ دونوں شخصیات کامیاب رہیں۔ خواتین کی تخلیقی نگارشات کا منظرِ عام پر آنا اُردو ادب کے منظر نامے میں نئے باب کا آغاز ثابت ہوا۔’’ **عصمت**‘‘ رسالے کے علاوہ دیگر رسائل بھی خواتین کی تخلیقات ان کے عصری شعور اور بیداری کا عندیہ دیتی ہیں۔ اس دور کی تخلیق کار خواتین میں نذر سجّاد حیدر، صغری ہمایوں، فاطمہ بیگم ،بیگم اختر سہروردی ،شائستہ اکرام اللہ اور شاعرات میں ز۔ خ۔ش (زاہدہ خاتون شیروانی)، صفیہ شمیم، رابعہ پنہاں اور بلقیس جمال نمایاں ہیں۔ زاہد خاتون شیروانیہ اور دیگر خواتین نے اپنے اصل نام کو مخفی رکھ کر قلمی نام سے اپنا مدعا بیان کیا۔ خاص طور پر’’ **عصمت** ‘‘رسالے کے اکتوبر 1913 ء کے شمارے میں چندے کی اپیل کے لیے لکھی جانے والی ایک نظم ز۔خ۔ش کی تحریر کر دہ عوام و خواص میں مقبول ہوئی۔ ان کے کلام کے دو مجموعے **"آئینہ حرم** "اور **"فردوس ِ تخیل"** ان کی قادر الکلامی اور شعری ذہانت کی گواہی پیش کرنے کے ساتھ ساتھ ایک عورت کی کیفیات ،تجربات اور احساسات کی غمازی کرتے ہیں۔

بلقیس جمال وہ نامور شاعرہ تھیں جنھوں نے انتہائی کم عمری میں غزل لکھ کر سونے کا تمغہ حاصل کیا ۔ان کی شاعری کا مجموعہ’’ **آئینہ جمال**‘‘ کے نام سے 1933ء میں شائع ہوا۔ بلقیس جمال کی شاعری اعلی جمالیاتی احساسات اور دل نشین اظہار بیان کی عکاسی کرتی ہے ۔ان کی شاعری کا منفرد پہلو نظموں اور غزلوں میں تانیثیت کے صیغے کا استعمال تھا۔ نیز خواتین کے مسائل کے حوالے سے اُن کے نظموں کے موضوعات ان کی نسائی شعور پر دال ہیں۔ اسی عہد میں خواتین کو ترقی پسند تحریک کے ذریعے اظہار رائے کاحوصلہ فراہم کیا ۔

**قیام پاکستان کے بعدشعری ادب میں تانیثی رجحانات:**

قیام پاکستان کے بعد بیسویں صدی کی چوتھی دہائی میں شاعری کے اُفق پر ادا جعفری ایک معتبر اور مستند حوالہ بن کر اُبھری۔ ان کے پہلے مجموعے میں **" ساز ڈھونڈتی رہی"** کہ دیباچے میں **قاضی عبدالغفار رقم طراز ہیں :**

> ’’یہ واقعہ کہ جدید ادب کے تقاضوں نے ہمارے ملکی خواتین کو اپنی طرف رجوع کر لیا ہے۔ ہندوستان کے موجودہ دور کی تاریخ کا اہم واقعہ ہے ۔قدامت اور جمود کے خلاف عوامی افکار نے جو راستہ اختیار کیا ہے۔ اس کے صحیح ہونے کا ثبوت اس سے بہتر اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خواتین جو عموماً ہر قوم میں سب سے زیادہ قدامت پسند ہو رہی ہیں اور ان کا ادب اور ان کی شاعری عمومی افکار کی آئینہ دار بننے پر آمادہ ہو گئی ہے ‘‘۔ (16)

چنانچہ ادا جعفری کے علاوہ مختلف شاعرات پروین شاکر، فہمیدہ ریاض، سارہ شگفتہ، کشور ناہید، تنویر انجم ،عذرا عباس، گلنار آفریں، فرح زبیر گیلانی، رضیہ کاظمی، فرزانہ اعجاز، شبنم شکیل ، نوشی گیلانی، زہرا نگار نے خالصتاً نسائی لب و لہجے میں شاعری کی مذکورہ بالا شاعرات نے جذبوں کی گھٹن، معاشرتی جبر، رومان انگیز جذبات اور نوجوان لڑکیوں کی خوابوں کی دنیا سے لے کر شادی بیاہ، نازک رشتوں کے مسائل، گھروں میں ان کے ساتھ پیش آنے والے حالات کو اپنی شاعری کے موضوعات میں شامل کر کے ایک بلند آہنگ نسائی آواز کی صورت اختیار کی۔ علاوہ ازیں سائنسی رویوں کے مختلف پہلو اور مرد اساس معاشرے میں عورت کی ذات کو محور بنا کر شعروں کی تخلیق کی ۔کشور ناہید نے اپنی شاعری اور نثر میں نسائی لہجے کے علاوہ اندیشوں اور اُمنگوں کی کشمکش کی عکاسی کی۔ ثمینہ راجہ نے عورتوں کو جبر کی زنجیروں میں جکڑا پیش کر کے معاشرے کے معاوندانہ رویے کی عکاسی کی۔ شبنم شکیل مشرقی معاشرے کے

تناظر میں زمانے کی سختی اور ظلم کو موضوع شاعری بناتی ہیں۔ فاطمہ حسن نے شعری مجموعے ''**بہتے ہوئے دستک سے درکار فاصلہ**'' ،''**یادیں بھی اب خواب ہوئیں**''،'' **وحشت سے دل کا فاصلہ**'' اور'' **کہانیوں کا مجموعہ**'' کہانیاں گم ہو جاتی ہیں کے عنوان سے تانیثی تصورات پیش کیے۔ اُن کا تحریر کردہ مقالہ "**فیمینزم اور ہم** "تانیثی ادب میں بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔ انھوں نے عالمی اور عصری تناظر میں خواتین کے حقوق پر روشنی ڈالی اور قیام پاکستان کے بعد سے تاحال خواتین شاعرات گھریلو مسائل، سماجی کرب، معصوم خواتین اور محبت کی سچائی اور سماج کے بدلتے ہوئے رویوں کو عہد حاضر کے حوالے سے پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں سر فہرست شائستہ یوسف ،سارہ شگفتہ، جمیلہ نشاط، ترنم ریاض وغیرہ شامل ہیں۔

**جدید نثری ادب میں تانیثی رجحانات :**

شاعری کے علاوہ نثری تخلیقات میں بھی افسانہ اور ناول نگار خواتین نے نسائی شعور کا بھرپور اظہار کیا ۔ان خواتین ادیباؤں نے نہ صرف اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بدولت اپنی پہچان پیدا کی بل کہ اُردو نثری سرمائے کو نئی جہات عطا کیں۔

اُردو ادب میں رشید ہ النساء کو پہلی خاتون ناول نِگار ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔اُنھوں نے1881ء میں ''**اصلاح النساء**'' تحریر کیا۔ اس ناول کو ان کے صاحبزادے محمد سلیمان نے شائع کروایا۔ اس کی ابتدائی اشاعتوں میں مصنفہ کے نام کی بجائے والدہ محمد سلیمان لکھا ہوا ہے ۔البتہ بعد میں شائع ہونے والے نئے ایڈیشن میں مصنفہ کا نام تحریر تھا۔

بیسویں صدی کے وسط میں خواتین نے ایسی عمدہ ناول نگاری کی کہ اُردو ادب کی نثری تاریخ ان کے ذکر کے بنا مرتب نہیں کی جا سکتی۔ افسانہ نگار خواتین نے بھی تخلیقی فن پاروں کے ایسے نمونے پیش کیے جن کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں۔ عصمت چغتائی کا ناول ''**ٹیڑھی لکیر** '' اور قرۃالعین حیدر کا ناول '' **آگ کا دریا** '' اُردو کے بہترین نثری فن پاروں کی فہرست میں نمایاں ہیں۔ اگرچہ ان سے پہلے بیگم نذر سجاد حیدر اور بیگم حجاب امتیاز علی قارئین کے لیے اجنبی نہ تھیں لیکن عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر کے ناولوں نے قارئین اور ناقدین کے لیے مطالعے اور تجربے کے متنوع پہلو پیش کیے۔ عصمت چغتائی نے ''**ٹیڑھی لکیر** ''اور افسانہ'' **لحاف** '' میں نسائی شعور کا واضح اظہار کیا۔ اُنھوں نے کمال جرأت سے اُس نسائی ہمدردی کا اظہار کیا جو کسی اور کے لیے بیاں کرنا قدرے مشکل تھا۔

قرۃ العین حیدر کے ناول ''**آگ کا دریا**'' کو پوسٹ ماڈرن فیمینیسٹ نقادوں نے جن میں ژولیا کرسٹوا سر فہرست ہیں، عورت کے تصورِ وقت کی مثالی پیشکش قرار دیا۔ اُن کے ناولوں کے علاوہ افسانوں میں نسائی شعور پوری آب و تاب کے ساتھ نمایاں ہے۔ اس کی مثال ''**اگلے جنم مو ہے بٹیا نہ کی جیو**'' ہے ۔ ترقی پسند تحریک نے نسائی شعور کی عکاسی میں اہم کردار ادا کیا۔ اس تحریک کی بدولت ڈاکٹر رشید جہاں ،صدیقہ بیگم مہاروی ،عصمت چغتائی، خدیجہ مستور، ہاجرہ مسرور جیسی لکھنے والی خواتین کو وہ سازگار ماحول ملا جس نے ادبی ورثے میں گراں قدر اضافہ کیا۔ خدیجہ مستور کے ناول ''**آنگن**'' کو آدم جی ایوارڈ ملنے کے بعد دیگر خواتین میں نیا ولولہ اور جوش پیدا ہوا۔ ان کے بعد جمیلہ ہاشمی کا ناول ''**تلاش بہاراں** '' اور'' **دشتِ سوس** ''، الطاف فاطمہ کا ناول ''**دستک نہ دو**'' رضیہ فصیح احمد کا ناول '' **آبلہ پا** '' مقبولیت حاصل کر گئے۔ ہاجرہ مسرور، بیگم اختر جمال ،نثار عزیز بٹ ،خالدہ حسین، فرخندہ لودھی کی تحریروں نے خواتین ادیباؤں کو مقبولیت اور قبولیت کے اعلیٰ مقام پر پہُنچا دیا۔

بانو قدسیہ افسانوں ،ناولوں اور ڈراموں کی تخلیق کاری میں نمایاں رہیں۔ زاہدہ حنا، رشیدہ رضویہ، فردوس حیدر، نیلم بشیر احمد، نگہت حسین نے افسانہ نگاری کی روایت کو فروغ دیا۔ فہمیدہ ریاض اور عذرا عباس اپنی تخلیقات میں نسائیت کی عکاسی کرتی نظر آتی ہیں ۔یہ سلسلہ بھارت اور بیرون ملک مقیم خواتین جن میں **واجدہ تبسم ،جیلانی بانو ، محسنہ جیلانی ، نعیمہ ضیاء الدین، رفعت مرتضیٰ، پروین فرحت** اور کئی خواتین تانیثی آواز بُلند کر کے ج اری رکھا۔ خالدہ حسین اپنے منفرد اندازِ نگارش کی افسانہ نگاری کا معتبر نام ہیں۔ تنقید کے حوالے سے ممتاز شیریں سر فہرست ہیں۔ اُنھوں نے منٹو کی کہانیوں اور ان کے کرداروں کا تجزیہ پیش کیا۔ اُنھوں نے موپساں اور چیخوف کا تقابلی موازنہ کر کے منٹو کو موپساں کے قریب تر قرار دیا۔ اُن کا تجزیہ، وسیع مطالعہ اور ان کے تخلیقی ذہن کے آمیزش سے جاندار رہا۔اُن کی بدولت تنقیدی شعبے میں خواتین کو صفِ اوّل میں شمار کیا جانے لگا ۔

''نسائی ادب ،اُردو ادب کا قابلِ قدر حصہ رہا ہے۔ نسائی شعور کی روایت ہمارے ثقافتی رجحان
**Culture Mindset** کی ترجمانی کرتی ہے ۔یہ خواتین کے ادراک و شعور کی آئینہ دار ہے۔

نسائی اظہار کا رویہ تاریخ سے جڑا ہوا ہے۔ نسائی ادب و تنقید نہ تو مغرب کی نقالی ہے نہ اس کا کوئی تصادم ہمارے اقدار سے ہے بلکہ یہ ہماری آبادی کے نصف حصّے کے ذہنی اور فکری سفر کا مطالعہ پیش کرتا ہے ۔یہ خواتین قلم کارواں کے نقطہ نظر ( (Point of view کو پیش کر رہا ہے اور آج ادب میں نکتہ نظر کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا"۔ (17)

**حوالہ جات :**


1. مرتبہ ) فاطمہ حسن ، فیمینزم اور ہم ، ادب کی گواہی ، کراچی ، وعدہ کتاب گھر ، جون 2005 ء ، ص151).1

2. 2.سیمون دی بووار ، عورت مترجم یاسر جواد ، لاہور فکشن ہاؤس ، 1999ء ، ص 114

3. 3. Feminism, a short introduction by Margaret Walters, New York, Oxford University Press, 2005, P: 2

4. ): 4مرتبہ ) فاطمہ حسن ، فیمینزم اور ہم ، ادب کی گواہی ، کراچی ، وعدہ کتاب گھر ، جون 2005 ء ، ص151

5. 5. Kamla Bhasin & Nighat Saeed Khan, Feminism and its relevance in south asia, P: 3

6. 6.:کلیم احسان بٹ ، اقبال کا کلام اور نو آبادیات ، مشمولہ پیغام آشنا ، ثقافتی قونصلیٹ سفارت اسلامی جمہوریہ ایران ، جلد 15 ، شمارہ 57 ، اسلام آباد ، 2014 ، ص 25

7. :7 ناصر عباس نیّر ، نوآبادیاتی صورتِ حال ، مشمولہ مابعد جدیدیت ( اطلاقی جہات ) ، سنگِ میل پبلی کیشنز ، لاہور ، 2018ءص296

**8.** 8. Feminism by Arpita Mukhopadhyay , Orient Blackswan , 2016 , Page : 1

9. 9.( مرتبہ ) فاطمہ حسن ، فیمینزم اور ہم ، ادب کی گواہی ، کراچی ، وعدہ کتاب گھر ، جون 2005 ء

10. 3.(مرتبہ )قاضی عابد : فہمیدہ ریاض فیمینزم اور ہم ، مشمولہ اُردو ادب اور تانیثیت ، (منتخب مضامین )، اسلام آباد ، پورب اکیڈمی 2016ء

-10 راج بہادر گوڑ ، ڈاکٹر ، نشاۃ الثانیہ اور علامہ شبلی ، مشمولہ سہ ماہی اُردو ادب( نئی دہلی ، انجمن ترقی اُردو، شمارہ 27، 3 ، 1996ء ) ص 65

11. Journal of language, culture and civilization, Volume 4, issue 1, Mareh 2022, page 63- 81

12. Homepage:http.jlcc.spcrd.org , ISSN (P) 31 March 2022 , page 2708-3748

13. محمد احمد خان ، اقبال اور مسئلہ تعلیم ( لاہور ، اقبال اکیڈمی،2021ء ) ص 336

14. ( مرتبہ ) فاطمہ حسن ، فیمینزم اور ہم ، ادب کی گواہی ، کراچی ، وعدہ کتاب گھر ، جون 2005 ء ،ص 13

15. پروفیسر حامد کاشمیری : تانیثی ادب : تنقیدی تناظر میں ، مشمولہ مابعد جدیدیت ، مرتبہ ، ڈاکٹر ناصر عباس نیّر ، سنگ ِمیل پبلی کیشنز ، لاہور، 2018ء ، ص 312-313

16. ( مرتبہ ) فاطمہ حسن ، فیمینزم اور ہم ، ادب کی گواہی ، کراچی ، وعدہ کتاب گھر ، جون 2005ء، ص 9

ACADEMIA International Journal for Social Sciences
Volume 5, Issue 3, 2026 ISSN-L (Online): 3006-6638

17. فاطمہ حسن ( فیمینزم اور ہم مشمولہ) گذشتہ صدی سے عہدِ حاضر تک، اُردو ادب میں نسائی شعور ایک مطالعہ، ص 104